امتحانی مشق نمبر 2

(یونٹ 5 تا 9)

سوال 1- دبستان دہلی کی شاعری کو کتنے ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے؟ وضاحت کریں۔ (20)

سوال 2- دبستان لکھنو کی نمائندہ شعری اصناف پر مفصل نوٹ لکھیں۔ (20)

سوال 3- اردو ادب کے لیے جان گل کرسٹ کی خدمات کا جائزہ پیش کریں۔ (20)

سوال 4- حالی کی ''مسدس'' مسلمانوں کے عروج وزواں کی داستان ہے؟ بحث کریں۔ (20)

سوال 5- اسلامی ادب کی تحریک کے وجود میں آنے کے کیا اسباب تھے؟ وضاحت کریں۔ (20)

ANS 01

اورنگزیب کی وفات کے بعد اُس کا بیٹا معظم تخت نشین ہوا لیکن اس کے بعد معظم کے بیٹے معز الدین نے اپنے بھائی کو شکست دے کر حکومت بنائی۔ معز الدین کے بھتیجے ”فرخ سیر “ نے سید بردران کی مدد سے حکومت حاصل کی لیکن سید بردران نے فرخ سیر کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اس طرح 1707ءسے لے کر 1819ءتک دہلی کی تخت پر کئی بادشاہ تبدیل ہوئے۔ محمد شاہ رنگیلا عیاشی کے دور میں نادرشاہ درانی نے دہلی پر حملہ کردیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی - پھر احمد شاہ ابدالی کے حملے نے مزید کسر بھی پوری کر دی - دوسری طرف مرہٹے ، جاٹ اور روہیلے آئے دن دہلی پر حملہ آور ہوتے اور قتل عام کرتے اس دور میں کئی بادشاہ بدلے اور مغل سلطنت محدود ہوتے ہوتے صرف دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی -اور آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انگریزوں نے معزول کر کے رنگوں بھیج دیا۔ یہ تھی دہلی کی مختصر تاریخ جس میں ہماری اردو شاعری پروان چڑھی - یہ ایک ایسا پرآشوب دور تھا جس میں ہر طرف بدنظمی ، انتشاراور پستی کا دور دورہ تھا۔ ملک میں ہر طرف بے چینی تھی۔

زبان میں فارسیت:۔

دبستا ن دہلی کے شعراءکے ہاں فارسیت کا بہت غلبہ تھا کیونکہ شعرائے دہلی فارسی کی شعری روایت سے متاثر تھے اور ان پر فارسی شعراءکا گہرا اثر تھا۔ ایران سے جو شعراءآتے تھے ان میں سے اکثر یہاں ہی رہ جاتے تھے۔ چنانچہ ، خسرو ، حسن ، عرفی ،نظیری ، طالب ، صائب اور بیدل وغیرہ مختلف ادوار میں یہاں رہے۔ اس کے علاوہ یہاں فارسی شعراءکی زبا ن تھی - نیز یہاں کے شعرا ءاردو اور فارسی زبانوں میں دسترس رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو ا کہ فارسی اسالیب و موضوعات وغیر ہ دہلی کے دبستان شاعری میں شامل ہو گئے۔ اس طرح بہت سے شعراء نے فارسی شعراءسعدی ، وحافظ کا ترجمہ کیا۔ اور خزانہ اردو کو مالا مال کیا۔ اس طرح دبستان دہلی کی شاعری میں فارسیت کا غلبہ ہے۔

Downloaded From Tajassus.com

جذبات عشق کا اظہار:-

دبستان دہلی کے شعراءکے ہاں جذبات و احساسات کے اظہار پر زیادہ زور ہے- دبستان دہلی کے شعراءنے عشق کے جذبے کو اولیت دی - بقول ڈاکٹر نور الحسن شعرائے دہلی کو اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ان کا اسلوب بیان اور طرز ادا خوب تر ہو بلکہ ان کی کوشش تھی کہ شاعری میں جذبات و احساس کا اظہار ہو جائے - اس لئے بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا شاعر کو عشق سے عشق ہو گیا ہے- دہلی کے کچھ شعراءعشق مجازی سے گزر کر عشق حقیقی سے سرشار ہوئے - ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ سے لو لگائی اور فیضان عشق کی بدولت ان میں ایسی بصیرت پیدا ہوئی کہ وہ تمام بنی نوع انسان سے محبت کرنے لگے - جبکہ کچھ لوگ عشق مجازی کی منزل پر رک گئے- چنانچہ ان کی شاعر ی میں محبت کا سوز اور تڑ پ موجود ہے- جبکہ کچھ لوگ نفس پر قابو نہ پا سکے اور وہ ابولہوسی میں مبتلا ہو کر رہ گئے- چنانچہ دہلی میں عشق کے یہ تینوں مدارج موجود ہیں-مثلاً درد جیسے شاعروں نے صوفی شاعری کی اور عشق حقیقی کو اپنی شاعر ی کا موضوع بنایا -

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

عشق مجازی:-

عشق کا دوسرا انداز جو دہلی میں بہت مقبول ہوا اس میں عشق حقیقی کے ساتھ ساتھ عشق مجازی کے جذبات بھی شامل ہوگئے - یہ رنگ میرتقی میر نے بہت خوبی سے نبھایا - ان کے جذبہ عشق میں وہ خلوص اور گہرائی تھی جس نے ان کی شاعری کوحیات جاوداں عطا کی- عشق کا یہ تیکھا انداز دبستان دہلی سے مخصوص ہے- عشق مجازی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں - جن میں دہلی کے تمام شعراءنے بڑی خوبصورتی سے ان جذبات کو شاعری کا روپ دیا ہے-

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

حزن و یاس :-

Downloaded From Tajassus.com

دبستان دہلی کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت رنج و الم اور حزن و یاس کا بیان ہے۔ دبستان دہلی کی شاعری کا اگر بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ دبستان دہلی کی شاعری میں یاس و ناامیدی کے جذبات بکثرت موجود ہیں۔ شاعرخواہ کسی موضوع پر بات کرے رنج و الم کا ذکرضرور آجاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس سارے دور میں کسی کو اطمینان و سکون نصیب نہ تھا۔ زندگی ایک خواب پریشاں بن کر رہ گئی تھی۔ ہر طرف نفسانفسی کا عالم تھا۔ کسی شے کو ثبات نہ تھا۔ ان حالات کا شاعری پر بھی گہرا عکس نظرآتا ہے۔ خارج میں تباہی و بربادی پھیلی ہوئی تھی اور تباہی و بربادی کے تاریک سائے شاعری میں بھی راہ پاتے ہیں۔ چنانچہ فنا کا احساس بہت تیز ہے۔ اس کے ساتھ اجڑے ہوئے شہر ، لٹے ہوئے نگر اور ویران گزر گاہیں جا بجا موجود ہیں۔ خصوصاً میر و سودا کے دور میں زندگی کی ناپائیداری کا احساس بہت شدت سے اظہار کی راہ پاتا ہے۔ چنانچہ حزن و یاس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

اس حزن و یاس کی فضاءکے بارے میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ " ظاہر ہے دہلی کی شاعری یک سر جذبات کی زبان و گفتگو ہے اور جذبات بھی وہی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر حرماں و مہجوری و ناکامی سے ہے۔"

تصوف:-

واردات قلبی کے اظہار کے بعد دبستان دہلی کے شعراءکا دوسرا محبوب ترین موضوع تصوف ہے۔ چونکہ ابتداءمیں اردو شاعری پر فارسی شاعری کی شعری روایت کا بہت زیادہ غلبہ رہا ہے جس کی وجہ سے اردو شعراءنے غیرشعوری طور پر فارسی شاعری کے اسالیب، سانچے ، اور موضوعات قبول کر لئے۔ دوسری طرف اس موضوع کو اس لئے بھی مقبولیت ملی کہ کہ تصوف میں بھی قناعت ، صبر و توکل اور نفی ذات کے نظریات نے زیادہ زور پکڑا کیونکہ اس زمانے کے حالات ہی ایسے تھے جن کی بناءپر لوگ ترک دنیا کی طرف مائل ہو رہتے تھے ۔ اس زمانے میں یہ خیال عام تھا کہ تصوف برائے شعر گفتن خوب است ان میں کچھ تو صوفی شعراءتھے لیکن زیادہ تر شعراءنے محض رسمی طور پر تصوف کے مضامین کو نظم کیا۔ چنانچہ ذوق اور غالب کے زمانے تک تقریباً ہر شاعر کے کلام میں تصوف

Downloaded From Tajassus.com

کے مضامین نظر آتے ہیں۔ تصوف کی مقبولیت کا دوسرا سبب یہ تصورات و اقدار تھے جو ہندوستان کی فضاء میں رچے بسے ہوئے تھے ۔ جن کی بدولت انہوں نے تصوف کو موضوع بنایا۔

مسافر اٹھ تجھے چلنا ہے جانب منزل
بجے ہیں کوچ کا ہر دم نقارہ شاہ حاتم

اسے کو ن دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

رمزیت اور اشاریت:۔

تصوف کی بدولت اردو شاعری میں بڑی وسعت پیدا ہوئی چنانچہ بقول ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ،

" دہلی میں تصوف کی تعلیم اور درویشی کی روایت نے خیالات میں بلندی اور گہرائی پیدا کی اور اسلوب میں متانت و سنجیدگی کو برقرار رکھا۔ تصوف کے روایات نے شاعری کو ایک اخلاقی لب و لہجہ دیا اور ابتذال سے دور رکھا۔ "

مسائل تصوف نے اردو غزل کو رمز و کنایہ کی زبان دی، پیر مغاں ، گل ، بلبل ، چمن ، شمع ، پروانہ ، میکدہ ، اسی طرح کی اور بہت سی علامتیں تصوف کے راستے اردو شاعری میں داخل ہوئیں ۔ تصوف نے اردو شاعری کو فکری پہلو بھی دیا اور استغنا کا درس دے کر درباداری سے الگ رکھا۔ مزاجوں میں خوداری اور بے نیازی پیدا کی ۔ تصوف کی بدولت اردو شاعری میں جو رمزیت اور اشاریت آئی اس سے شعراءنے بہت فائدہ اٹھایا اور چند لفظوں میں معنی کی دنیائیں آباد کیں۔ ذیل کے اشعار دیکھئے کہ پردوں میں کتنے جہاں آباد دکھائی دیتے ہیں۔

ساقی ہے اک تبسم گل ، فرصت بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے کو گہر ہونے تک

داخلیت:۔

دبستان دہلی کی شاعری کا ایک اور نمایاں پہلو داخلیت ہے۔ داخلیت سے مراد یہ ہے کہ شاعر باہر کی دنیا سے غرض نہیں رکھتا بلکہ وہ اپنے دل کی واردات کا اظہار کرتا ہے۔ اگر باہر کی دنیا کے متعلق کچھ کہتا ہے تو اُسے بھی شدید داخلیت میں ڈبو کر پیش کرتا ہے۔ یہ داخلیت دہلی کے ہر شاعر کے یہاں ملتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیں کہ شعرائے دہلی کے ہاں خارجیت بالکل نہیں ہے۔ خارجیت بھی ہے۔ لیکن داخلیت میں واردات قلبی یعنی عشق و محبت کے مضامین اور ان مصائب کا بیان شعرائے دہلی نے نہایت خوش اسلوبی سے کیا ہے۔

Downloaded From Tajassus.com

پاس ناموس عشق تھا ورنہ
کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مرچلے

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

واقعیت و صداقت:-

دبستان دہلی کی ایک خصوصیت واقعیت و صداقت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان شعراءکے ہاں مبالغہ وغیرہ کم ہے۔ ان شعراءنے مبالغہ سے زیادہ کام نہیں لیا اگرچہ مبالغہ کا استعمال شاعری میں برا نہیں ہے لیکن جس بھی کسی چیز کا استعمال حد سے تجاوز کر جائے تو پھر اُسے مناسب و موزوں نہیں سمجھا جاتا ۔ اسی طرح حد سے زیادہ مبالغہ شاعری کو مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ شعراءدہلی کے ہاں اعتدال پایا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ صداقت کے اظہار کے لئے پر تکلف زبان کو بھی موزوں سمجھا جاتا ہے۔

ہر گھڑی کان میں وہ کہتا ہے
کوئی اس بات سے آگاہ نہ ہو

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

سادگی:-

شعرائے دہلی کے ہاں زبان میں بھی سادگی ، صفائی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ شعرائے دہلی نے جس طرح مضامین میں واقعیت و صداقت کو مدنظر رکھا ہے۔ اسی طرح زبان بھی سادہ اور عام فہم استعمال کی ہے۔ اگرچہ ان شعراءنے صنعتوں کا استعمال کیا ہے لیکن وہ صنعت برائے صنعت کے لئے نہیں ہے۔ اس کے بجائے ان شعراءنے معنوی حسن کی طرف زیادہ توجہ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تشبیہ اور استعارے کا استعمال حد سے آگے نہیں بڑھتا۔

میرانُ نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اختصار:-

Downloaded From Tajassus.com

شعرائے دہلی کے کلام میں جہاں زبان میں سلاست و روانی کا عنصر نمایاں ہے وہاں اختصار بھی ہے۔ اس دور میں دوسری اصناف کے مقابلے میں غزل سب سے زیادہ نمایاں رہی ہے۔ اور غزل کی شاعری اختصار کی متقاضی ہوتی ہے۔ اس میں نظم کی طرح تفصیل نہیں ہوتی بلکہ بات اشاروں کنایوں میں کی جاتی ہے۔ اس لئے ان شعراءکے ہاں اختصار ملتا ہے۔ نیز غزل کا مخصوص ایمائی رنگ بھی موجود ہے۔ یہاں کے شعراءاپنے دلی جذبات و احساسات کو جو ں کا توں بڑی فنکاری سے پردے ہی پردے میں پیش کر دیتے ہیں۔ اسی با ت کا ذکر کرتے ہوئے محمد حسن آزاد لکھتے ہیں کہ : ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اس سے خیالات دل پر گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ اس واسطے اشعار صاف اور بے تکلف ہیں۔ “

ہم نشیں ذکر یار کر کچھ آج
اس حکایت سے جی بہلتا ہے
دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا ہے

ANS 02

سال 1707ء اورنگزیب عالم گیر کی موت کے بعد مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اُن کے جانشین تخت کے لئے خود لڑنے لگے۔ ان نااہل حکمرانوں کی وجہ سے مرکز مزید کمزور ہوا۔ اور باقی کسر مرہٹوں، جاٹوں اور نادرشاہ افشار اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کر دی۔ سال 1722ء میں بادشاہ دہلی نے سعادت علی خان کو اودھ کا صوبیدار مقر ر کیا۔ مرکز کی کمزوری سے فائد ہ اٹھاتے ہوئے جلد ہی سعادت علی خان نے خود مختاری حاصل کر لی۔ اور اودھ کی خوشحالی کے لئے بھر پور جدوجہد کی جس کی بنا پر اودھ میں مال و دولت کی فروانی ہوئی۔ صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے اودھ کی آمدنی میں مزید اضافہ کیا اور عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کوششیں کیں۔ آصف الدولہ نے مزید اس کام کو آگے بڑھایا۔ لیکن دوسری طرف دہلی میں حالات مزید خراب ہوتے گئے۔ امن و سکون ختم ہو گیا۔ تو وہاں کے ادباءو شعراءنے دہلی چھوڑنے میں ہی عافیت سمجھی۔ اور بہت سے شاعر لکھنؤ میں جا کرآبا د ہوئے۔ جن میں میرتقی میر بھی شامل تھے۔ دولت کی فروانی، امن و امان اور سلطنت کے استحکام کی وجہ سے اودھ کے حکمران عیش و نشاط اور رنگ رلیوں کے دلدادہ ہوگئے۔ شجاع الدولہ کو عورتوں سے خصوصی رغبت تھی جس کی بناء پر اس نے محل میں بے شمار عورتوں کو داخل کیا۔ حکمرانوں کی پیروی امراء نے بھی کی اور وہ بھی اسی رنگ میں رنگتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

Downloaded From Tajassus.com

بازاری عورتیں ہر گلی کوچے میں پھیل گئیں۔ غازی الدین حیدر اور نصیر اور نصیر الدین حیدر نے آباءو اجداد کی پیروی جاری رکھی اور واجد علی شاہ نے تو اس میدان میں سب کو مات دے دی۔ سلاطین کی عیش پسندی اور پست مذاقی نے طوائف کو معاشرے کا اہم جز بنا دیا۔ طوائفوں کے کوٹھے تہذیب و معاشرت کے نمونے قرار پائے جہاں بچوں کو شائستگی اور آداب محفل سکھانے کے لئے بھیجا جانےلگا۔

شعرو ادب پر اثرات

عیش و نشاط، امن و امان اور شان و شوکت کے اس ماحول میں فنون نے بہت ترقی کی۔ راگ رنگ اور رقص و سرور کے علاوہ شعر و شاعری کو بھی بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ دہلی کی بدامنی اور انتشار پر اہل علم و فن اودھ اورخاص کر لکھنؤ میں اکٹھا ہونا شروع ہوگئے۔ یوں شاعری کا مرکز دہلی کی بجائے لکھنؤ میں قائم ہوا۔ دربار کی سرپرستی نے شاعری کا ایک عام ماحول پیدا کر دیا۔ جس کی وجہ سے شعر و شاعری کا چرچا اتنا پھیلا کہ جابجا مشاعرے ہونے لگے۔ امرا ء، رؤساء اور عوام سب مشاعروں کے دیوانے تھے۔ ابتداء میں شعرائے دہلی کے اثر کی وجہ سے زبان کا اثر نمایاں رہا لیکن، آہستہ آہستہ اس میں کمی آنے لگی۔ مصحفی اور انشاءکے عہد تک تو دہلی کی داخلیت اور جذبات نگاری اور لکھنؤ کی خارجیت اور رعایت لفظی ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ لکھنؤ کی اپنی خاص زبان اور لب و لہجہ بھی نمایاں ہوتا گیا۔ اور یوں ایک نئے دبستان کی بنیاد پڑی جس نے اردو ادب کی تاریخ میں دبستان لکھنؤ کے نام سے ایک مستقل باب کی حیثیت اختیار کر لی۔

دبستان لکھنؤ

دلی اور لکھنؤ کے فرق اور امتیازات کو سب سے پہلے ناسخ نے متعین کیا اور ان خصوصیات کو اپنی شاعری میں ملحوظ خاطر رکھا شاید یہی وجہ ہے کہ ناسخ کو دبستان لکھنؤکا بانی کہا جاتا ہے ۔ سید وقار عظیم نے لکھنوی دبستان شعر کی مندرجہ ذیل خصوصیات قرار دی ہیں تکلف اور تصنع، محسوسات کی سادگی اور واردات کی سچائی کی بجائے رنگینی اور فکر کی باریک بینی۔لفظی صنعت گری، دوراز کار استعارے اور تشبیہیں، سخت اور سنگلاخ زمینیں، پر شکوہ الفاظ اور تراکیب، دل کی بجائے دماغ سے تخاطب، لب و لہجہ میں ہلکا پن جو بار بار بدمستی ہوسنا کی عریانی پر منتج ہوتا ہے. ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے باعتبار زبان لکھنوی شاعری کی حسب ذیل امتیازی خصوصیات گنوائی ہیں:

عربی وفارسی الفاظ کاکثرت استعمال

قافیہ پیمائی:

Downloaded From Tajassus.com

طویل غزل سے غزل کو فائدے کے بجائے یہ نقصان ہوا کہ بھرتی کے اشعار غزل میں کثرت سے شامل ہونے لگے۔ شعرانے زور کلام دکھانے کے لئے لمبی ردیفیں اختیار کرنی شروع کر دیں جس سے اردو غزل میں غیر مستعمل قافیوں اور بے میل ردیفوں کا رواج شروع ہوا۔ معمولی قافیوں اور ردیفوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جا نے لگا۔ اس سے قافیہ پیمائی کا رواج شروع ہوا۔ ذیل میں بے میل ردیفوں سے قافیوں کی چند مثالیں درج ہیں۔

انتہائی لاغری سے جب نظر آیا نہ میں
ہنس کر کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیے

فوج لڑکوں کی جڑے کیوں نہ تڑا تڑ پتھر
ایسے خبطی کو جو کھائے ہے کڑا کڑ پتھر

لگی غلیل سے ابرو کی، دل کے داغ کو چوٹ
پر ایسے ہی کہ لگے تڑ سے جیسے زا غ کو چوٹ

بات طویل غزلوں اور، بے میل ردیفوں اور قافیوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ شعرا لکھنو نے اپنی قادر الکلامی اور استادی کا ثبوت دینے کے لئے سنگلاخ زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی.

طویل غزلیں:

لکھنوی شاعری کی ایک اور نمایاں بات طویل غزلیں ہیں۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں کہ ابتدا جرات مصحفی نے کی جو دلی دبستا ن سے تعلق رکھتے تھے۔ جو دلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ جا بسے تھے۔ لیکن لکھنوی شعرا نے اس کو زیادہ پھیلایا اور بڑھایا اور اکثر لکھنوی شعرا کے ہاں طویل غزلیں بلکہ دو غزلہ، اور سہ غزلہ کے نمونے ملتے ہیں۔اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ لکھنؤ کے اس دور میں پرگوئی اور بدیہہ گوئی کو فن قرار دے دیا گیا تھا۔ نیز لوگ قافیہ پیمائی کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے طویل غزلیں بھی لکھی جانے لگیں چنانچہ ۵۲-۰۳۱ اشعار پر مشتمل غزلیں تو اکثر ملتی ہیں۔ بلکہ بقول ڈاکٹر خواجہ زکریا بعض اوقات اس سے بھی زیادہ طویل غزلیں بھی لکھی جاتی تھیں۔

نسائیت:

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے لکھنوی دبستان کی شاعری کاایک اہم عنصر نسائیت بتایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ہر زمامے ہر قصہ اور ہر زبان میں ,عورت, شاعری کا بڑا اہم موضوع رہا ہے۔ لیکن لکھنؤ کی سوسائٹی میں عورت کو اہم مقام حاصل ہو گیا تھا۔ اس نے ادب پر بھی گہرا اثرا ڈالا۔ اگر یہ عورتیں پاک دامن اور عفت ماب ہوتیں تو سوسائٹی اور ادب دونوں پر ان کا صحت مند اثر پڑتا لیکن یہ عورتیں بازاری تھیں۔ جو صرف نفس حیوانی کو انگیخت کرتی تھیں۔ جبکہ دوسری طرف عیش و عشرت اور فراغت نے مردوں کو مردانہ خصائل سے محروم

Downloaded From Tajassus.com

کرکے ان کے مردانہ جذبات و خیالات کو کمزور کر دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے جذبات خیالات اور زبان پر نسائیت غالب آگئی۔ چنانچہ ریختہ کے جواب میں ریختی تصنیف ہوئی۔ اس کا سہرا عام طور پر سعادت یا ر خان رنگینؔ کے سر باندھا جاتا ہے۔ رنگینؔ کے بعد انشا اور دوسرے شعرا نے بھی اسے پروان چڑھایا۔ ان شعرا کے ہاں ریختی کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں عورتوں کے فاحشانہ جذبات کو ان کے خاص محاوروں میں جس طرح ان لوگوں نے نظم کیا ہے وہ لکھنؤ کی شاعری اور سوسائٹی کے دامن پر نہ مٹنے والا داغ بن کر رہ گیا ہے۔

رعایت لفظی:

دبستان لکھنؤ کی ایک اور خصوصیت رعایت لفظی بتائی جاتی ہے اس پہلو کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں۔

لکھنؤ کا معاشرہ خوش مزاج، مجلس آرا اور فارغ البال لوگوں کا معاشرہ تھا۔ مجلس زندگی کی جان, لفظی رعایتیں ہوتی ہیں۔ مجلوں میں مقبول وہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں " زبان پر پوری قدرت ہو اور لفظ کا لفظ سے تعلق، اور لفظ کا معنی سے رشتہ پوری طرح سمجھتے ہوں۔ لفظی رعایتیں محفل میں تفریح کا ذریعہ ہوتی ہیں، اور طنز کو گوارا بناتی ہیں۔ لکھنؤ میں لفظی رعایتوں کا از حد شوق تھا۔ خواص و عوام دونوں اس کے بہت شائق تھے۔ رؤسا اور امرا تک بندیاں کرنے والوں کو باقاعدہ ملازم رکھا کرتے تھے۔ ان ہی اسباب کی بنا پر لکھنوی شاعری میں رعایت لفظی کی بہتات ہے اور لفظی رعایتیں اکثر مفہو م پر غالب آجاتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات محض لفظی رعایت کو منظوم کرنے کے لئے شعر کہا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر

ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہوں باغباں
لالہ کا پھول رکھنا امانت کی گور پر

غسل کرلے یہیں دریا میں نہانے کو نہ جا
مچھلیاں لپٹیں گی اے یار تیرے بازوسے

وصل کی شب پلنگ کے اوپر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت
بعد مرنے کے میری توقیر آدھی رہ گئی

تشبیہ واستعارات میں پیچ داریکی

Downloaded From Tajassus.com

گرچہ تشبیہ اور استعارے کا استعمال ہر شاعر کرتا ہے لیکن یہ چیز اس وقت اچھی معلوم ہوتی ہے جب حد اعتدال کے اندر ہو۔ شعرا دلی کے ہاں بھی اس کا استعمال ہوا لیکن لکھنؤ والوں نے اپنی رنگین مزاجی کی بدولت تشبیہوں کا خوب استعمال کیا اور اور ان میں بہت اضافہ کیا۔ محسن کاکوروی، میرانیس، نسیم، دبیر، نے پرکیف، عالمانہ اور خوب صورت تشبیہیں برتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی شعرا صرف تشبیہ برائے تشبیہ بھی لے آئے ہیں جس سے کلام بے لطف اور بے مزہ ہو جاتا ہے۔

سبزہ ہے کنارے آب جو پر
یاخضر ہے مستعد وضو پر

محو تکبر فاختہ ہے
قد و قامت سر و دلربا ہے

کیاری ہر ایک اعتکاف میں ہے
ساقی کی مست آنکھ پہ دل ٹوٹ جاتے ہیں اور آب رواں طواف میں ہے

شیشے جھکے ہوئے ہیں پیالوں کے سامنے
آگیا وہ شجر حسن نظر جب ہم کو

بوسے لے کے لب شریں کے چھوڑے
مستی میں زلف یارکی جب لہر اگی

بوتل کا منہ ہمیں دہن مار ہوگیا

محاورات والفاظ کااستعمال

دبستان دلی سے وابستہ شاعر اور ادیبوں کی تحریروں میں روز مرہ بکثرت ملتا ہے۔ کیونکہ دبستان دلی کی بنیاد ہی سادگی اور سلاست پر ہے۔ اس کے برعکس دبستان لکھنؤ والے تکلف، تصنع، تشبیہ، استعارات سے عبارت کو سجاتے ہیں۔ جس سے اصل مقصد و مطلب قاری کی نگاہ سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر نثر میں اس فرق کا بہترین نمونہ میر امن کی شہرہ آفاق تصنیف ''باغ و بہار'' اور رجب علی بیگ سرور کی ''فسانہ عجائب'' ہے۔ شاعری میں میر تقی میر اور آتش لکھنوی اس کی بہترین مثال ہیں۔ محاورے دونوں استعمال کرتے ہیں، دبستان لکھنؤ والے بھی اور دبستان دلی والے بھی۔ لیکن یہاں بھی ایک فرق بہت واضح ہے۔ وہ یہ کہ ''دبستان لکھنؤ'' والے محاوروں کا استعمال غیر ضروری طور پر محض شوقیہ کرتے ہیں۔ جب کہ ''دبستان دلی'' والے صرف وہیں محاورہ استعمال کرتے ہیں جہاں ضروری ہو

ابتذال اور عریانی

Downloaded From Tajassus.com

محبوب کےبیان میں عریانی وہرزہ گوئی کی جو حدیں جرات وانشاءکےکلام سےشروع ہو ئی, ناسخ اوران کےشاگرد انہیں رکاکت وابتذال اورغلوکی حدتک لےگیے_لکھنوی شاعروں نےنہ صرف محبوب کےجسم کاایک ایک عضوگنناشروع کیابلکہ اسےچوٹی سےایڑی تک بےنقاب کرڈالا__ اس ساری بحث سے ہر گز یہ مقصود نہیں کہ لکھنوی شعراءکےہاں اعلی درجے کی ایسی شاعری موجود نہیں جو ان کے سوز و گداز جذبات اور احساسات اور واردات قلبیہ کی ترجمان ہو- تمام نقادوں نے اس بات کی تائید کی ہے بلکہ عذلیب شادنی جنہوں نے لکھنوی شاعری کے خراب پہلوئوں کو تفصیل کے ساتھ نمایاں کرکے پیش کیا ہے وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ شعرائے لکھنؤکےہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو پڑھنے والے کے دل پر گہرااثر چھوڑتے ہیں- ایسے نمونے ناسخؔ اور آتشؔ کے علاوہ امانتؔ اور رندؔ وغیرہ کے ہاں سب سے زیادہ ملتے ہیں- یہاں اس بات کے ثبوت میں مختلف شعرا کے کلام سے کچھ مثالیں

رشک سے نام نہیں لیتے کہ سن لے نہ کوئی
دل ہی دل میں اسے ہم یاد کیا کرتے ہیں

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو
ٹکڑے ہوتا ہے جگر ناسخ تیری فریاد سے

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جاہی ڈھونڈتا تیری محفل میں رہ گیا

کسی نے مول نہ پوچھا دل شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

بتوں کے عشق میں کیا جی کو اضطراب دیا
یہ دل دیا کہ خدا نے مجھے عذاب دیا

دل نے شب فرقت میں کیا ساتھ دیا میرا
مونس اسے کہتے ہیں غم خوار اسے کہتے

آعندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

ہم اسیروں کو قفس میں بھی ذرا چین نہیں
روز دھڑکا ہے کہ اب کون رہا ہوتا ہے

حرم کو اس لئے اٹھ کر نہ بتکدے سے گئے
خدا کہے گا کہ جور بتاں اٹھا نہ سکا

Downloaded From Tajassus.com

لکھنؤکےشعراکےدواوین سےعورتوں کےزیورات وپوشاک اورسامان آرائش کی مفصل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے,زنانہ الفاظ ومحاورات کےغلبہ سےبھی اندازہ ہوتاہےکہ معاشرہ کےاعصاب پرعورت کس طرح سوارتھی اوروہ عورت کس مزاج وافتادطبع اوراخلاقی رتبہ کی حامل تھی, معاشرہ کےاسی ذوق اوراس شعری اورادبی رجحان کاسلسلہ وہ ابتذال اورمعاملہ بندی سےملاتےہیں,نسائیت وفحش گوئی پرریختی کی بنیادپڑی,جس میں پیشہ ورعورتوں کےمستبذل جذبات بازاری وعامیانہ زبان میں ادا ہوتے ہیں.بطورنمونہ چنداشعارملاحظہ ہوں:

دیکھناکیاحسن کی دولت کاکوٹھاتوڑکر
نکلی ہیں سرپرلیےدوبدرہ زرچھاتیاں

کس قدرصاف ہےتمہاراپیٹ
صاف آئینےکاہے سارا پیٹ

وہ توآنچل سےدوپٹے کوچھپاتےہیں بہت
ہےیہ جوبن نکلی ہی پڑتی ہیں باہرچھاتیاں

سمجھوں نہ حباب آپ کےپستانوں کوکیوں کر
دریاشکم صاف ہے دریاکا بھنور ناف

کیاچکنےہیں,کیاصاف ہیں,کیاگول سرین ہیں
بےجرم ہیں,نایاب ہیں,ان مول سرین ہیں

زانوں کی طرح صاف ہیں اوس حور کی ساقیں
آئینے کی رانیں ہیں تو بلور کی ساقیں

دبستان لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت دبستان دہلی سے بالکل الگ ہے۔دلی کی معاشی اور اقتصادی حالت بہت خراب تھی۔جب سے اردو پروان چڑھی دہلی ہر قسم کی آفتوں کا نشانہ بنتی رہی یہی وجہ ہے کہ جعفرزٹلی سے لیکر غالب اور داغ تک تمام ممتاز شعراء شہر آشوب لکھتے رہے۔بہادر شاہ ظفر کے درد بھرے نالے اسکے گواہ ہیں۔ایسے حالات میں جب کہ بادشاہ سے لے کر فقیر تک معاشی بدحالی میں گرفتار ہوں، روز روز انقلابات ہو رہے ہوں۔ایسے مقام کے باشندوں پر مایوسی اور ناکامی کا ہونا لازمی ہے۔اس کے برخلاف لکھنؤ میں تمام طرح کی سہولتیں فراہم کی جارہی تھیں، عیش و عشرت کا بازار گرم تھا۔اس لیے وہاں کے لوگوں میں سرمستی اور رنگین مزاجی کا ہونا لازمی تھا۔ان کا نظریہ زندگی کے متعلق مثبت تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دہلی میں تباہی تھی تو لکھنؤ میں تعمیر و ترقی۔اس لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دہلی کی شاعری آہ و غم کی شاعری ہے اور لکھنو کی شاعری واہ اور خوش مزاجی کی شاعری ہے۔

Downloaded From Tajassus.com

دبستان دہلی کی شاعری میں روحانی یا دلی جذبات کی کارفرمائی ہے اور لکھنؤ میں ظاہری حسن اور سراپا کا ذکر ہے۔دہلی کی شاعری کے لئے دلگداز ہونا ضروری ہے جبکہ لکھنؤ میں صرف طبیعت کا موضوع ہونا۔دلی کے شعراء نے حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی شاعری داخلی ہے اسی لئے ان کے یہاں روحانی اور تصوفانہ مضامین زیادہ نظر آتے ہیں۔اس کے برعکس لکھنؤ کی شاعری میں سراپانگاری اور معاملہ بندی تک شعراء محدود نظر آتے ہیں۔

لکھنؤ کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔دراصل لکھنویت دہلویت کے مقابلے شعر و شاعری کا ایک دوسرا رخ ہے۔دہلی کے وہ شعراء جو لکھنؤ آ گئے تھے وہاں کی خوشحالی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔1765ء میں شجاع الدولہ نے فیض آباد کو دارالحکومت بنایا تو اس کی تعمیر میں لاکھوں روپے صرف کیے۔آصف الدولہ نے 1775ء میں لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت بنایا تو وہ تمام شان شوکت لکھنؤ میں منتقل ہوگئی۔آصف الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ تک کے زمانے کا لکھنؤ ایک رنگین خواب تھا اس لیے یہاں کے لوگوں میں رنگین مزاجی اور رنگین خیالی رچ بس گئی تھی۔اس ماحول نے وہاں کے شعراء کے خیالات کو بھی آلودہ کردیا اور آہستہ آہستہ فحاشی ایک مستقل صنف بن گئی اور فحش گوئی اور نسوانیت سے ملکر ‘ریختی’ کی بنیاد پڑی۔ریختی میں عورتوں کے احساسات و جذبات کو ان ہی کی زبان اور محاورے میں پیش کیا جاتا ہے۔

دبستان لکھنؤ کے شعراء نے اپنی تمام تر توجہ ظاہری خوبصورتی پر صرف کی،اندرونی احساسات و جذبات پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔تکلف تصنع کو لکھنوی تہذیب و معاشرت میں زیادہ فوقیت دی گئی۔ناسخ کو لکھنوی شعراء میں استاد مانا جاتا ہے۔ انہوں نے اصلاح زبان کی تحریک شروع کی اس کے پیش نظر انہوں نے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کو خارج کرکے فارسی اور عربی کے الفاظ کو جگہ دی۔دبستان دہلی کے شعراء نے ہندی اور دوسری زبانوں سے بھی استفادہ کیا لیکن لکھنوی شاعری نے اصلاح زبان کے نام پر عربی اور فارسی کو اولیت دی۔لکھنوی شعراء کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے لغت پر زیادہ توجہ دی اور اسی کے مطابق زبان کی ادائیگی پر زور دیا۔جبکہ دہلی کے شعراء نے مروجہ زبان پر زیادہ توجہ دی۔

دبستان لکھنو میں مرثیہ کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔انیس اور دبیر نے اس صنف کو ترقی دی اور مرثیے کو رونے اور رولانے سے نکال کر نئی شکل عطا کی۔مدرسہ لکھنوی مزاج نے موسیقی اور رقص کو خاص طور سے اپنایا جس کی وجہ سے ڈرامائی نظم کی بنیاد ڈالی گئی۔دبستان

Downloaded From Tajassus.com

دہلی اور دبستان لکھنؤ میں خاص فرق زبان کا ہے۔دلی میں بعض الفاظ جو مونث بولے جاتے تھے لکھنؤ میں مزکر کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دبستان دلی کے شاعری داخلی شاعری ہے اور دبستان لکھنؤ کی شاعری میں محبوب کی ظاہری صورت یا سراپا کو بیان کیا گیا ہے۔اپنا اصلی اس سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں دبستانوں کی اپنی اپنی شناخت ہے جس کی وجہ سے دونوں میں امتیاز کیا جاتا ہے۔

رات کو چوری چھپے پہنچا جو میں
غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے
کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت
ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت

ANS 03

فورٹ ولیم کالج کے بعد دلّی کالج اردو نثر کی ترقی کادوسرا زینہ کہا جاسکتا ہے اور اتفاق سے اس کو قائم کرنے والے بھی انگریز ہی تھے۔ فورٹ ولیم کالج زبان اور ادب کی طرف راغب ہونے کی پہلی کڑی تھی اور دلّی کالج دوسری۔ اگرچہ ان دونوں کے درمیان وقت کا بہت زیادہ تفاوت نہیں ہے۔ لیکن اتنا تھوڑا فرق بھی سمجھ بوجھ کر قدم اٹھانے والے کے لیے بہت کافی ہوتا ہے اور شاید اس وجہ سے دہلی کالج نسبتاً فورٹ ولیم کالج سے زیادہ نکھری اور سنوری ہوئی شکل تھی۔ دونوں کو قائم کرنے کا اگرچہ ظاہری مقصد ایک سا لگتا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر دونوں میں یہ فرق تھا کہ فورٹ ولیم کالج انگریزی طلباء کو ہندستانی زبان سکھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور دہلی کالج ہندستانی طلباء کو انگریزی تعلیم سے واقف کرانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب فورٹ ولیم کالج رو بہ انحطاط تھا، سیاسی اعتبار سے ہندستان اپنی ساری طاقت کو کھو چکا تھا اور انگریز پورے طور پر ہندستان پر قابض ہو چکے تھے، لہٰذا اب ان کا دخل یہاں کی تہذیب و ادب میں بھی ہو چکا تھا۔ ہند ستانیوں کی اچھائی اور برائی کی ذمہ داری بھی انگریزوں کے سر آ چکی تھی۔ ایسے ماحول میں ہندستان کی تعلیم و ادب کی ترقی وغیرہ کی ذمہ داری بھی انگریزوں پر تھی۔ اپنے آپ کو یہاں کی زبانوں میں ڈھالنے کے بعد یہاں کے لوگوں پر اپنی انگریزی تعلیم کا بار اٹھانے کے لیے طرح طرح کے پروگرام بنائے۔ گروپ بنے۔ کمیٹیاں قائم کی گئیں اور اس طرح کی ایک کمیٹی 17،جولائی 1823ء کو دہلی میں بنائی گئی۔ جس پر خرچ کرنے کے لئے ایک لاکھ روپئے کی رقم طے کی گئی۔ اس کمیٹی کے سکریٹری ولسن منتخب کیے گئے۔ جو سنسکرت اور دیگر

Downloaded From Tajassus.com

علوم مشرقیات کے ماہر تھے۔ جے۔ ٹلرر۔ (J.TAYLER)نے اس منظوری کے بعد پورے دہلی شہر کا جائزہ لیا کہ کس مقام پر ایک ایسے کالج کی بنیاد ڈالی جائے جس میں مشرقی اور مغربی تعلیم کو جاری رکھا جا سکے۔ جائزہ لینے کے بعد جے ٹیلر نے جو رپورٹ دی وہ حسب ذیل ہے:

"دہلی میں تعلیم کی حالت بڑی افسوس ناک ہے۔ پرانے اوقاف بے توجہی کا شکار ہیں اور شرفاء تک اپنے بچوں کو پڑھانے کا انتظام نہیں کر سکتے۔ اس وقت پرانے مدارس سسک رہے ہیں، لیکن ان کی عمارتیں اور معلم موجود ہیں۔ اگر تعلیم کی ازسرِ نو تنظیم ہو تو اچھے نتائج نکل سکتے ہیں۔"

اس خیال کے تحت اس وقت کا ایک تعلیمی ادارہ مدرسہ غازی الدین جس کی بنیاد 1792ء میں پڑ چکی تھی اور اب تک یہ مدرسہ اسی نام سے مشہور تھا اور دہلی کی مذہبی اور ادبی زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ 1828ء میں یہ مدرسہ دہلی کالج کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں :

"غرض اس مجوزہ کالج کا افتتاح 1825ء میں ہوا اور اس شاہانہ عطیے میں سے اس کالج کے لیے پانچ سو روپئے ماہانہ مقرر کیے گئے۔ مسٹر جے۔ ٹیلر مقامی مجلس کے سیکریٹری ایک سو پچہتر روپئے ماہانہ پر اس کے پرنسپل ہوئے۔"

اور تین مقاصد کو لے کر (الف) علم و ادب کا احیاء اور انہیں ترقی دینا۔ (ب)ہندستانی علماء کی حوصلہ افزائی کرنا۔ (ج) علم اور سائنس کو ہندستان کے برطانوی مقبوضات کے باشندوں میں رائج کرنا اور انہیں فروغ دینا۔ کالج پر پوری توجہ دی جانے لگی۔ رفتہ رفتہ حکمرانوں کی جانب سے اس کے اخراجات پر خاص توجہ دی جانے لگی۔ جلد ہی معاشی طور پر ایک انقلاب آیا۔

1825ء میں اعتماد الدولہ نے مدرسے میں مشرقی علوم کے لیے ایک لاکھ ستر ہزار کی رقم وقف کر دی، جس سے اس کالج کو بہت بڑا سہارا مل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کے تمام شعبوں نے پورے طور پر منظم ہو کر اپنے کارنامے انجام دینے شروع کر دئے اور اس مدرسے نے ایک نئی شکل اختیار کر کے دہلی کالج کے نام سے ملک بھر میں شہرت حاصل کی۔

دلّی کالج نے اپنی شہرت تو اختیار کر لی، لیکن جس مقصد کے لیے وزیر لکھنؤ کی جانب سے اتنی کثیر رقم دی گئی وہ فوت ہو گیا۔ یعنی اس رقم کا مقصد محض علوم مشرقی کو فروغ دینا تھا، لیکن انگریزوں نے اس پر توجہ کم دی اور تین سال بعد 1828ء میں کالج میں ایک الگ انگریزی شعبہ کھول دیا۔ ابتدا میں سماجی اعتبار سے اس کے اچھے اثرات نظر میں آئے، لیکن رفتہ رفتہ انگریزوں نے اپنے مقصد میں کامیابی پائی۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے انگریزی کا شعبہ کھولا، انگریزی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سنسکرت، عربی،

Downloaded From Tajassus.com

فارسی کے درجوں پر بھی پوری اہمیت دی جاتی تھی۔ نتیجہ کے طور پر مشرقی اور مغربی تعلیم دونوں زور و شور سے آگے بڑھنے لگیں۔ دونوں زبانوں کی خصوصیات ابھر کر سامنے آنے لگیں۔ لیکن رفتہ رفتہ انگریز اپنے مقصد کی طرف بڑھنے لگے۔ انھوں نے انگریزی شعبہ کی اہمیت میں اضافہ شروع کر دیا۔ انگریزی پڑھنے والوں کے لیے ایک خاص قسم کا وظیفہ مقرر کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زیادہ تر طالب علم انگریزی کی طرف بڑھنے لگے۔ اور اس کالج کے قائم کرنے کا اصل مقصد بھی یہی تھا۔ لیکن باوجود اس کے کہ طلباء انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگے، مشرقی علوم کی دلچسپی میں ذرا بھی کمی نہ آئی۔ یہی سبب ہے کہ اس وقت کا ہر عالم اپنی زبان تو جانتا ہی تھا، ساتھ ہی اس نے انگریزی تعلیم کی شہرت اور اس کی ترقی کے راز کو بھی جاننے کی کوشش کی تھی۔ اور یہی بات انگریزی تعلیم کی کامیابی کی وجہ بن گئی۔

امتداد زمانہ کے تحت دلّی کالج کو باد سموم کے جھونکوں سے بھی دو چار ہونا پڑا اور 1857ء کا ہنگامہ اس کے لیے بھی مصیبت بن کے آیا۔ جب میرٹھ کی فوج دہلی میں گھس آئی تو تمام انگریز حکام ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس میں ٹیلر صاحب (پرنسپل) باغیوں کے ہاتھوں مار ڈالے گئے۔ اساتذہ منتشر ہو گئے۔ کتابیں جلا دی گئیں۔ مالک رام لکھتے ہیں :

"اس شورش سے کالج کو بہت نقصان ہوا۔ مدرسوں میں جو لوگ دیسی سپاہی کے چنگل سے بچ نکلے، وہ تتر بتر ہو گئے۔ کتاب خانہ وقف تاراج ہوا۔ جاہلوں نے کتابوں کو چیر پھاڑ کے ورق ورق کر دیا۔ یہاں کا سامان توڑ پھوڑ کر اسے ہمیشہ کے لیے بیکار بنا دیا۔"

سات برس تک بند رہنے کے بعد 1864ء میں یہ کالج پھر قائم ہوا۔ اب اس کی جگہ بھی تبدیل ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ 1857ء کے ہنگامے نے اسے اس قدر کمزور کر دیا کہ پہلے والی شکل اب نہ رہ گئی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اب انگریزوں کے رویّے میں بھی تبدیلی آ چکی تھی۔ تقریباً نصف صدی کی عمر پانے کے بعد یہ کالج کتنی مشکلات سے گذرتا ہوا 1877ء میں اپنے اختتام پر پہنچ گیا۔

دلّی کالج اردو نثر کی ارتقا میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ رہی کہ تمام مضامین فلاسفی، سائنس یا کوئی بھی مضمون ہو اردو کے ذریعے پڑھائے جانے لگے۔ لہٰذا اردو نثر میں یہ پہلا موقع تھا جب مشرقی اور مغربی علوم آپس میں گلے مل رہے تھے۔ اور ایک دوسرے کی خصوصیات کو باہم جذب کرتے جا رہے تھے۔ اور صورت حال یہ تھی کہ دلّی کالج سے قبل کا ماحول محض داستانی تھا۔ لیکن دلّی کالج نے مغربی علوم کی روشنی میں مشرقی علوم کو چمکایا۔ فرسودگی کو دور کرنے کی کوشش کی اور دل و دماغ میں علم و روشنی کی ایک نئی کرن جگمگائی۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کا لج سے رام چندر، پیارے

Downloaded From Tajassus.com

لال آشوب، مولوی کریم الدین، امام بخش صہبائی، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، نذیر احمد جیسی اہم اور نامور شخصیتیں وجود میں آنا مشکل تھیں۔ اس کے بعد گرد و پیش کے تمام ماحول کو بیدار کرنے اور جملہ علوم و فنون سے دلچسپی پیدا کرنے میں جو رول ادا کیا ہے اس کا اندازہ اس وقت کی اہم شخصیات اور تصنیفات کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ یہاں پر ان سب کا ذکر کر کے طوالت منظور نہیں۔ کالج کے اساتذہ اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر انگریز ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہندستانی بھی اس میں شامل تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہ اور مولوی امام بخش صہبائی جیسے منتخب اساتذہ کا تعلق بھی اسی کالج سے تھا۔ پہلی بار دہلی کالج کے ذریعہ مشرق و مغرب کا اتنا بھرپور ملاپ ہوا۔ بقول عبدالحق مرحوم کے کہ ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات کے اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں جادو کا سا کام کیا اور ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور ایک نئی جماعت ایسی پیدا کی جس میں سے ایسے پختہ، روشن خیال اور جامع النظر مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور ہماری سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔ نذیر احمد، آزاد، ذکاء اللہ سب اس کالج کی ہی دین ہیں، جنہوں نے اردو نثر میں ایک انقلاب پیدا کیا۔ نذیر احمد نے ناولوں کا آغاز کیا۔ آزاد نے "آب حیات" لکھی اور جدید نظموں کی طرف ذہن موڑا۔ ذکاء اللہ نے ترجمے کیے۔ ان سب ادیبوں نے ادب کو ایک نئے ڈھرّے اور ایک نئی راہ پر لگایا اور ایک ایسا مستحکم راستہ نکالا جس پر آگے چل کر دوسرے ادیبوں نے اس راہ کو اور خوبصورت بنایا۔ نذیر احمد اپنے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں :

"معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، ٹالریشن، گورنمنٹ کی سچی خیر خواہی، اجتہاد اعلیٰ وغیرہ۔ یہ چیزیں جو تعلیم کے لیے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا۔ اور اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو کیا بتاؤں کا ہوتا؟ مولوی ہوتا۔ تنگ خیال ہوتا۔ ۔ ۔ اپنے نفس کے احتساب سے فارغ۔ دوسروں کے عیوب کا متمنّی۔ بر خود غلط مسلمانوں کا نادان دوست۔ تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا۔"

اردو نثر کے ارتقاء میں دلّی کالج فورٹ ولیم کالج کے بعد اور علی گڑھ تحریک سے قبل ایک اہم کارنامہ ہے، جس کی خدمات کبھی فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ یہ ان دونوں کے بیچ کی ایک کڑی ہے۔ اس کی روشنی، اس کا بالغ ذہن، انگریزیت اور اس کی بیداری نے سر سید کی ہمت افزائی کی اور انھوں نے علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی۔

فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ داستان ادب اور صحافت نے زور پکڑا اور سلیس اور آسان نثر کا اضافہ ہوا۔ دلّی کالج نے اس آسان نثر میں فکر و روشنی اور انگریزی علوم کے وہ عناصر جذب

Downloaded From Tajassus.com

کر دئے جس سے اس زبان کے نثری سرمایہ میں ایسی چمک اور رنگینی آئی کہ اس کی شکل اچانک نکھر آئی اور وہ اس قابل ہو گئی کہ وہ اپنی خوبصورتی اور اپنی رنگینی سے دوسروں کی نظروں میں دلکشی کا سبب بن گئی۔ لوگوں کی نظریں اس کی جانب اٹھنے لگیں۔ علی گڑھ تحریک کا تمام نثری سرمایہ اسی کا ردّ عمل ہے۔ فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور علی گڑھ کالج کے درمیان تسلسل کے بارے میں ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی کی یہ تحریر قابل توجہ ہے:

"اردو نثر کی تاریخ میں دلّی کالج، علی گڑھ تحریک اور فورٹ ولیم کالج کے درمیان ایک کڑی ثابت ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد نثر پر جمود طاری ہونے کے بجائے دلّی کالج اور اس سے متعلق حضرات کی بدولت چند اعلیٰ روایت کی داغ بیل پڑی اور ادب میں نمو اور بالیدگی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ فورٹ ولیم کالج سے یہ اس بنا پر ممتاز تھا کہ یہاں ہندستانیوں کو اردو کے ذریعے مغربی علوم و ادب سے آشنا کرانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جب کہ فورٹ ولیم کالج کا اصل مقصد حکومت کی ضروریات کے پیش نظر انگریزوں کو مشرقی علوم و ادب اور زبانوں سے واقفیت بہم پہنچانا تھا۔ یہ فرق ان دونوں اداروں کی شائع کی ہوئی کتابوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ علی گڑھ کالج اور دلّی کالج میں کوئی بنیادی اختلاف نہ ہونے کی وجہ سے ایک اہم فرق یہ تھا کہ مغربی علوم کی تدریس کا ذریعہ انگریزی ہی کو بنایا گیا، جب کہ دہلی کالج نے اردو کو بطور ذریعہ تعلیم تسلیم کیا اور اس زبان کے ذریعے ہندستان مغربی علوم کی اشاعت کو ترجیح دی۔"

ANS 04

عربی کے شاعر، زبیر ابن ابی سلمیٰ کا قول ہے کہ سب سے بہتر شعر جو تم کہہ سکتے ہو وہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو لوگ کہیں کہ سچ کہا ہے۔

حالیؔ کی مسدس ''مد و جزر اسلام'' اس قول پر پوری اترتی ہے۔ سچ کے ساتھ اس میں دو خوبیاں وہ بھی ہیں جن کا ذکر ہمارے قدما نے کیا ہے یعنی سادگی اور جوش۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ جنھیں یہ قدرت ہوتی ہے کہ وہ شعر کے ذریعے سے دلوں میں اثر پیدا کردیں انھیں ایک ایک لفظ کی قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ فلاں لفظ لوگوں کے جذبات پر کیا اثر رکھتا ہے اور اس کے استعمال کرنے یا نہ کرنے سے بیان میں کیا خوبی پیدا ہوتی ہے۔ مسدس ''مد و جزر اسلام'' کا لکھنے والا ایسا ہی شاعر ہے۔

اس نظم کے محرک سرسید تھے۔ انھیں حالیؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ تھا اور اس وقت مسلمانوں کی جو حالت تھی اس کا بھی ادراک تھا۔ انھوں نے حالیؔ سے کہاکہ مسلمانوں کے

Downloaded From Tajassus.com

عروج و زوال کی داستان ایک ایسی پر اثر نظم میں بیان ہونی چاہیے جو انھیں سوتے سے جگادے، اور ان میں فکر و عمل کی شمع پھر سے روشن کردے۔

مسدس حالیؔ 1879ء میں مکمل ہوئی۔ حالیؔ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ''ہر چند کہ اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور اس خدمت کا بوجھ اٹھانا دشوار تھا لیکن ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل ہی سے نکلی تھی، دل ہی میں جاکر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑھی میں ابال آیا۔ ایک افسردہ دل اور بوسیدہ دماغ جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، انھیں سے کام لینا شروع کیا۔ اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔ دنیا کے مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہیں ہوا، مگر بہرحال دل میں دھن لگی رہی۔ بارے الحمدللہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندے کی بساط کے موافق تیار ہوگئی اور ناصح مشفق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا۔ صرف ایک امید کے سہارے پر یہ راہ دور دراز طے کی گئی ہے، ورنہ منزل کا نشان نہ اب تک ملا ہے نہ آیندہ ملنے کی توقع ہے''۔

حالیؔ نے اس مسدس کے آغاز میں چند بند بطور تمہید لکھ کر پہلے عرب کی اس ابتر حالت کا نقشہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جو زمانۂ جاہلیت کہلاتا ہے۔

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ
ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ
نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے
درندے ہوں جنگل میں بے باک جیسے

پھر اسلام کا چاند نکلتا ہے اور اللہ کے رسولؐ کی تعلیم سے یہ ریگستان دفعتاً سر سبز و شاداب ہوجاتا ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

★★★★

Downloaded From Tajassus.com

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا
رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

حالیؔ نے پھر یہ ذکر کیا ہے کہ کس طرح اللہ کے رسولؐ امت کی کھیتی کو ہرا بھرا چھوڑ کر اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ پھر بتایا ہے کہ مسلمانوں نے کس طرح دینی اور دنیاوی ترقی میں تمام عالم پر سبقت حاصل کی اور پھر اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں کے تنزل کا حال بیان کیا ہے اور قوم کے لیے اپنے ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آکر مسلمان دیکھ سکتے ہیں کہ کون تھے اور کیا ہوگئے۔

حالیؔ لکھتے ہیں ''اگرچہ اس جاں کاہ نظم میں جس کی دشواریاں لکھنے والے کا دل اور دماغ ہی خوب جانتا ہے، بیان کا حق نہ مجھ سے ادا ہوا ہے اور نہ ہوسکتا تھا مگر شکر ہے کہ جس قدر ہوگیا اتنی امید بھی نہ تھی''۔

موضوع کی نوعیت، حقیقت بیانی اور زبان و بیان کی سادگی اور بے ساختگی نے مسدس حالیؔ کو بے پناہ مقبولیت بخشی اور یہ ہماری قومی شاعری کی اولین سنگ میل ثابت ہوئی۔ اس نظم نے سر سید کو اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے حالی کو خط میں لکھا ''بے شک میں اس کا محرک ہوں اور میں اس کو اپنے اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں جب خدا روز محشر مجھ سے پوچھے گا کہ تو کیا لایا ہے تو میں عرض کرونگا کہ حالیؔ سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں''۔

مسدس کو چھپے ڈیڑھ صدی ہونے کو آئی ہے لیکن اس کی مقبولیت میں کوئی کمی نہ ہوئی ہے، یہ اب تک اتنی بار چھپی ہے کہ شاید ہی کوئی دوسری کتاب چھپی ہو اور اتنی مقبول ہوئی ہو کہ بار بار چھپے۔

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں ''اس نظم کی روانی حیرت انگیز ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا امڈا چلا آرہا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک عجیب تسلسل ہے، جس کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا اور پڑھنے والے کو ایک لمحے کے لیے بھی کہیں رکنے کی نوبت نہیں آتی۔ جوش کی وہ فراوانی ہے گویا ایک چشمہ ابل رہا ہے۔ باوجود ادبی خوبیوں کے سادگی کا یہ عالم ہے کہ اس پر ہزار صنایع بدایع، قربان ہیں اور ہزار خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کی بنت صداقت پر ہے۔ ادب میں حسن و خوبی کا آخری معیار صداقت یا حقیقت ہے۔ شعر کی نسبت جو یہ کہا گا ہے کہ اسے

Downloaded From Tajassus.com

حقیقت یعنی زندگی اور واقعات زندگی سے وابستہ ہونا چاہیے وہ اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ یہ مسدس ہماری قومی زندگی کا کامل مرقع ہے جس میں ہمارے خد و خال صاف نظر آتے ہیں''۔

ANS 05

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلوترقی پسند تحریک اپنے خاص سیاسی،ادبی اور سماجی تناظرمیں جس قدر مقبول ہوئی اسی قدر اسے طعن وتشنیع کا نشانہ بھی بنایا گیا۔اس تحریک کی ہمہ گیر مقبولیت میں جہاں اس کے جدت پسند منشور اور اس کے تحت تخلیق ہونے والے ادب کا عمل دخل ہے ،جو فکر کے ٹھہرے ہوئے پانی میں پہلا پتھر ثابت ہوا ،وہاں ان شخصیات کی شب وروز کی محنت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جنہوں نے پورے خلوص کے ساتھ اس کے منشور پر عمل کیا۔خود ترقی پسندوں کی نظر میں اس کے مقابلے میں کوئی اور تحریک ٹھہرتی ہی نہیں۔ظہیر کاشمیری اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سے لے کر موجودہ دور تک اردو ادب میں اگر کوئی معتبر تحریک ہے تو وہ ترقی پسند ادب کی تحریک ہے ۔اس تحریک کے زیرِ اثر جو ہمہ جہتی لٹریچر پیدا ہوا اس کے مقابل پر کوئی رجحان ابھی تک ادب میں پیدا نہیں ہوا۔"(۱)

تحریک کوئی بھی ہو اور کسی قسم کی ،وہ یوں ہی جنم نہیں لے لیتی بلکہ ہر تحریک کے عناصر بقول پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی ،پہلے سے فضا میں موجود ہوتے ہیں جو خود کو تسلیم کرانے کی کوشش کرتے ہیں ،تنظیم وترتیب کے عمل سے گزرتے ہیں پھر نمایاں ہوکر ایک عہد کے عام شعور کا حصہ بن جاتے ہیں ۔(۲)جب ہم ترقی پسند تحریک کی مقبولیت کے اساسی عناصر تلاش کرتے ہیں تو ہماری نگاہیں سجاد ظہیر جنہیں ترقی پسند تحریک کا باوا آدم کہتے ہیں ،سے بھی پہلے پروفیسر احمد علی اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری پر جا ٹھہرتی ہیں۔یہ ہر دوادیب رومانی باغی کے طور پر سامنے آئے۔پروفیسر احمدعلی نے دسمبر ۲۳۹۱ءمیں افسانوں کی ایک کتاب "انگارے"کے نام سے شائع کی جس میں احمدعلی کے علاوہ سجاد ظہیر،رشید جہاں اور محمود اظفر کے افسانے شامل تھے۔افسانوں کی یہ کتاب رومانیت کے خلاف بغاوت نامہ اور ترقی پسندی کا نقطہ آغاز تھی۔انگارے کے افسانوں میں سجاد ظہیر کے بقول سنجیدگی اور ٹھہراؤکم اور سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصّہ اور ہیجان زیادہ تھا۔(۳)جوگندر پال ،انگارے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انگارے کی کہانیاں ترقی پسند قدروں کا راست اور بلند بانگ اظہار کرتی ہیں اور اگرچہ فنی اعتبار سے کوئی بہت عمدہ معیار نہیں بنا پائیں تاہم اس لیے اتنی اہم ہیں کہ اردو قارئین کو ان

Downloaded From Tajassus.com

کے ذریعے پہلی بار ہم عصر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا موقع فراہم ہوا۔اس کتاب کی بدولت ایک سیدھی لکیر میں پٹتی ہوئی اردوکہانی ایک دم ہمہ جہت ہونے لگی اور یوں اس کی موضوعاتی وسعت میں آنے والے دور کی بعض بڑی کہانیوں کے لیے زمین ہموار ہوتی چلی گئی۔"(۴)

انگارے کی کہانیاں اردوادب میں نئے تجربے کی حیثیت رکھتی تھیلیکن مشرق کے ثقہ مزاج نے انہیں قبول کرنے سے انکار کردیا۔نیاز فتح پوری اور عبدالماجد دریابادی جیسے مصنفین نے اس کتاب کی مخالفت میں مضامین اور اخبار"مدینہ"اور"سرفراز"نے مخالفانہ اداریے لکھے چنانچہ مارچ ۱۹۳۳ء میں یہ کتاب ضبط کر لی گئی۔

انگارے محض ایک تجربہ تھا۔اس کتاب میں زندہ رہنے کی قوت نہیں تھی۔اگر اس کی ضبطی کاواقعہ پیش نہ آتا تو شاید یہ کتاب بہت جلد زمانے کی گرد میں گم ہوجاتی ۔اس کی ضبطی نے اسے غیر معمولی اہمیت دے دی نتیجۃًلوگ اسے تلاش کرنے پر مائل ہوئے اور بقول پروفیسر احمد علی لوگوں نے اسے چُھپ چُھپ کر والہانہ دلچسپی سے پڑھا۔(۵)

انگارے نے بلاشبہ مشرق کی تہذیبی روایات کو شکستہ کرنے کی کوشش کی اور کتاب کی ضبطی نے اس تلاطم کو تیز کرنے میں مدد دی چنانچہ نوجوان ادبا رومانیت سے ہٹ کر زندگی کے مسائل کے بارے میں سوچنے لگے اور اس کا عملی ثبوت پروفیسر احمد علی نے اپنی نئی کتاب"شعلے"میں دیاہرچند شعلے میں انگارے جیسی گرمی نہیں تھی تاہم جس ترقی پسند انداز کو انگارے میں اہمیت ملی تھی وہی شعلے میں بھی موجودتھا۔۔انگارے اور شعلے نے فضا میں تحرک توپیدا کیا لیکن اس بغاوت کو جورومانی نوعیت کی تھی ،فکری بنیاد مہیا نہ ہو سکی۔دوسری طرف فطرت کے جن پوشیدہ رازوں کو ادب کے ذریعے منکشف کرنے کا آغاز کیا گیا تھا عوام ان کی ضرورت اور اہمیت سے واقف نہیں تھے۔(۶)

ترقی پسند تحریک کو اساس فراہم کرنے والوں میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اہم نام ہے۔ اپنے ایک مقالے"ادب اور زندگی "میں جو ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا ،انہوں نے لکھا:

"۱۔صحیح ادب کا معیاریہ ہے کہ وہ انسانیت کے مقصد کی ترجمانی اس طریقے سے کرے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے اثرقبول کرسکیں ،اس کے لیے دل میں خدمتِ خلق کا جذبہ پہلے ہوناچاہیے۔

۲۔ہر ایمان دار اور صادق ادیب کا مشرب یہ ہے کہ قوم وملت اور رسم وآئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی ،یگانگی اور انسانیت کی وحدت کا پیغام سنائے۔

Downloaded From Tajassus.com

۳۔ادیب کو رنگ ونسل اور قومیت ووطنیت کے جذبات کی مخالفت اور اخوت اور مساوات کی حمایت کرنی چاہیے اور ان تمام عناصر کے خلاف جہاد کا پرچم بلند کرنا چاہیے جو دریائے زندگی کو چھوٹے چھوٹے چوبچوں میں بند کرنا چاہتے ہیں۔"(۷)

بادی النظر میں یہ خیالات وہی تھے جو جن کا عملی اظہار" انگارے" اور" شعلے "کے افسانوں میں کیا گیا تھا۔

پیرس میں ہونے والی ادیبوں کی بین الاقوامی کانفرنس وہ اہم عنصر ہے جو ترقی پسند تحریک کی اساس ثابت ہوا۔جولائی ۱۹۳۵ء میں دنیا کے چند اہم ادیبوں نے پہلی بار ادب کو تحریک بنانے پر زور دیا تھا۔یہ کانفرنس 'World Congress of the Writers for the defence of Culture'کے نام سے نازی ازم اور فاشزم کے دوہرے عفریت کے خلاف نبردآزما ہونے کے لیے بلائی گئی تھی۔اس کانفرنس میں ہنری باربس،میکسم گورکی،رمین اولاں،تھامس مان،آندرے مارلو اور والڈ فرینک وغیرہ شریک تھے۔اس کانفرنس نے طے کیا تھا کہ ادیب وشاعر اپنی ذات کے نہاں خانوں میں مقیّد رہنے کی بجائے انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب وثقافت کی اعلیٰ اقدار کی پاسبانی کریں گے ۔اس کانفرنس کا پیغام تھاکہ رجعت پسندوں کا مقابلہ کیا جائے اور فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کردیا جائے۔

سجاد ظہیر جو انگارے کی تدوین میں برابر کے حصے دار تھے ،جب ادیبوں کی اس بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہوئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ دنیا کی دوسری زبانوں اور ممالک کے ادیب بھی انہی مسائل سے نبرد آزما ہیں جن سے خود وہ اور ان کی زبان وملک کے ادیب دوچار ہیں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ملک کے ادیبوں کو بھی ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے ۔سجاد ظہیر اس وقت تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن میں مقیم تھے اور وہاں چند ہم خیال ادیبوں کا ایک حلقہ بھی قائم کررکھا تھا جس کی ہر مہینہ باقاعدگی سے نشستیں بھی ہوتی تھیں ۔یہ نوجوان ادیب وشاعرادب کی تخلیق کے ساتھ ساتھ بین لاقوامی اور خود اپنے ملک کے حالات کا تجزیہ کرتے تھے۔

کانگریس میں شرکت کے بعد سجاد ظہیر نے اسی حلقے کو انجمن ترقی پسند مصنفین میں بدل دیا اور اس کی باقاعدہ تنظیم کی ،اس کا ایک دستور بھی ترتیب دیا۔دستور کی ترتیب میں ڈاکٹر گھوش،محمددین تاثیر،پرمودسین گپتا اور ملک راج آنند بھی شریک ہوئے۔اسی دستور کو انجمن کی ایک نشست میں منظوری دی گئی جولندن میں چیئرنگ کراس روڈ سے متصل "نان کنگ ریسٹورنٹ"کے زیریں کمرے میں منعقد ہوئی تھی اور پھر آگے چل کر لکھنؤمیں منعقدہ پہلی کانفرنس میں بھی یہی دستور منظور کیا گیا۔اس دستور کے اہم نکات یہ تھے:

Downloaded From Tajassus.com

”ہندوستانی مصنفوں کا فرض ہے کہ جو نئے ترقی پذیر رجحانات اُبھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشوونما میں پورا حصہ لیں--ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اورفنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لیے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے--ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہیں اس لیے زندگی کے جس شعبے میں ردعمل پائیں گے انہیں اختیار کریں گے --ہم اس انجمن کے ذریعے ہراس جذبے کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔اس کام میں ہم اپنے اور غیر ملکیوں کی تہذیب وتمدن سے فائدہ اُٹھائیں گےہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے -یہ بھوک،افلاس،سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری ،پستی اور توہم پرستی کی طرف لے جارہے ہیںہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو اُبھارتی ہیں اور رسموں واداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تغیّر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔“(۸)

یہ بہت پُر حوصلہ اعلان تھا -اردو ادب کی تاریخ میں ایسی آواز پہلے کبھی نہیں اُٹھی تھی۔اس منشور کے بعد لکھنؤ،الہ آباد اور پھر متعدد کانفرنسوں میں اعلانات اور خطبوں کی شکل میں ”نیاادب“اور ”شاہراہ“کے شماروں میں اس عزم کا باربار اظہار کیا گیا -ادبی رجحانات پر تنقید کی گئی -آزادئ اظہار ،اپنے ادب ،سماج اور تہذیب پرتنقید کی اہمیت پر خاص طور سے زیادہ زور دیا گیا--یہ وہ زمانہ تھا جب قومی زندگی میں احتجاج کی لے بہت اونچی ہوگئی تھی - جلسے،مظاہرے،نعرے،روزمرہ زندگی کا دستور بن چکے تھے اور اس وقت کا ذہین وحساس مصنف اسی تلاطم کی اُٹھتی ہوئی موج تھاچنانچہ ادب کی سطح پر بھی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوئیں--قدیم ہئیتوں سے نئے کام لیے گئے -نظم ونثر کی نئی ہئیتوں کی تلاش میں عالمی ادب اور ہندوستان کے علاقائی ادب سے استفادہ کیا گیا۔(۹)

ترقی پسند تحریک کی مقبولیت اور گھن گرج کا تمام تر انحصار اس کے اساسی دستور پر تھاجو سائیکلوسٹائل کروا کر اس کی کاپیاں ہندوستان میں ڈاکٹر محمد اشرف(علی گڑھ)،محمود اظفراور ان کی بیوی رشید جہاں(امرتسر)،بیرن مکرجی(کلکتہ)،یوسف حسین خان(حیدرآباد)،ہتھی سنگھ(بمبئی)وغیرہ کو بھیجیں گئیں تاکہ وہ اس کی بنیاد پر ہندوستان میں انجمن کی شاخیں قائم کرسکیں -اسی دوران سجاد ظہیر خود بھی ہندوستان واپس آگئے اور اپنے والد کے ساتھ الہ آباد میں رہنے لگے اور اس طرح ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کا پہلا ہندوستانی دفتر الہ آباد میں احمدعلی کے گھر پر قائم ہوا۔سجاد ظہیر نے ایک طرف تو پریم

Downloaded From Tajassus.com

چند ،جوش ملیح آبادی،مولوی عبدالحق جیسے مقتدر ادیبوں کو انجمن کا مسودہ دکھا کر ان کی تائید اور ہمدردی حاصل کی وہیں نوجوان ادیبوں کے ایک بہت بڑے گروہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ان میں فراق اور اعجاز حسین بھی تھے جو الہ آباد یونیورسٹی میں طالب علم تھے۔علی سردار جعفری،جاں نثار اختر،حیات اللہ انصاری،مجاز،اخترحسین رائے پوری،خواجہ احمدعباس،شاہد لطیف اور سبط حسن تھے جن کی بدولت علی گڑھ میں نئے ادبی رجحانات کا فروغ ہورہا تھا۔فیض،صوفی غلام مصطفےٰ تبسم،میاں افتخار الدین،فیروزالدین منصور،سہیل عظیم آبادی،تمنائی اور اختر اورینوی بھی تھے جن کی وجہ سے پنجاب وبہار میں ترقی پسند ادبی تحریک کے لیے زمین ہموار ہوئی۔(۱۰)

کم از کم برصغیر پاک وہند کی سطح پہ یہ پہلا موقع تھا کہ ادب کو زندگی سے مربوط کرنے کی بات کی گئی اور اسے محلوں سے نکال کرجھونپڑیوں تک لے جانے کا عزم کیا گیا۔ادب کو انسانی استحصال کے خلاف استعمال کرنے کی خوش آئندروایت کا آغاز کیا گیا ۔اس تحریک کو شروع سے ہی فعال حیثیت حاصل ہوگئی اور جلد ہی اس کا تحرک اور ردِّعمل دیکھنے میں آیا۔

ترقی پسند تحریک کی پہلی کُل ہند کانفرنس ۱۵اپریل ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔اس کانفرنس کی اہم بات خود منشی پریم چند کا خطبۂ صدارت تھا جس میں انہوں نے ادب کی دائمی قدروں حسن وصداقت،آزادی اور انسان دوستی کو اعلیٰ ادب کا جزو لاینفک قرار دیتے ہوئے کہا کہ ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقیدِ حیات ہے ،چاہے وہ مقالوں کی شکل میں ہو یا افسانوں کی یا شعر کی،اسے ہماری حیات کا تبصرہ کرنا چاہیے---مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میں اور چیزوں کی طرح آرٹ کو بھی افادیت کے میزان پر تولتا ہوں ۔ہے شک آرٹ کا مقصد ذوقِ حُسن کی تقویت ہے اور وہ ہماری روحانی مسرت کی کنجی ہے لیکن ایسی کوئی ذوقی،معنوی یا روحانی مسرت نہیں ہے جو اپنا افادی پہلو نہ رکھتی ہو،مسرت خود ایک افادی شئے ہے---ادیب کا مشن محض نشاط ،محفل آرائی اور تفریح نہیں ہے ۔اس کا مرتبہ اتنا نہ گرائیے ۔وہ وطنیت اور سیاست کے پیچھے چلنے والی حقیقت نہیں بلکہ ان کے آگے مشعل دکھاتی ہوئی چلنے والی حقیقت ہے۔(۱۱)

منشی پریم چند نے ترقی پسند تحریک کو توازن اور اعتدال کی راہ دکھائی اور انہوں نے ادب کاجو فطری نصب العین مقرر کیا تھا وہ معاشرے کے خارج اور فرد کے داخل کو یکساں طور پر متاثر کرسکتا تھا چنانچہ سیّد سجاد ظہیر نے اس صدارتی خطبے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی پسند تحریک کی غرض وغایت کے متعلق شاید اس سے بہتر کوئی چیز ابھی تک نہیں لکھی گئی۔(۱۲)

Downloaded From Tajassus.com

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء کا زمانہ ترقی پسندادیبوں کے لیے ان کے عروج کا زمانہ رہا ہے۔مخالفین کے حملوں اور انجمن کے اندر کی نظریاتی بحثوں کے باوجود ان برسوں میں ترقی پسندی ہندوستانی ادب کا غالب رجحان رہی اور ہندوستان کے بیشتر نامی گرامی ادیب اور نوجوانوں کا ایک غالب حصہ اس تحریک کے جلو میں آگے بڑھتا رہا ۔دراصل یہ وہ زمانہ تھا جب ہر ہندوستانی چاہے وہ دانشور ہو یا مزدور ،سیاست دان ہو یاکسان،طالب علم ہو یا جاگیر دارجذباتی طور پر ایک اکائی تھا اور ہر ایک کی منزل آزادی تھی۔اپریل ۱۹۳۹ء میں جب انجمن کا اپنا رسالہ"نیاادب"شائع ہوا تو اس کی ادارت کی ذمہ داری سبطِ حسن،مجاز اورعلی سردار جعفری کو سونپی گئی۔نیاادب نے نہ صرف ترقی پسند ادب کی ترویج واشاعت کے فرائض سرانجام دیے بلکہ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کو ترقی پسند تحریک اور اس کے مقاصد سے آگاہ بھی کرایااور اس طرح ترقی پسند تخلیق وتنقید میں ان کی رہنمائی کی۔

۱۹۳۸ء کے وسط تک ترقی پسند تحریک نے لاہور ،لکھنؤ اور حیدرآباد دکن میں اپنے مراکز قائم کرلیے ۔اس عرصے میں اردو اور ہندی ادیبوں کی تین کانفرنسیں منعقد ہوئیں ۔تحریک کے نظریات کو فروغ دینے کے لیے ایک انگریزی سہ ماہی رسالہ"نیو انڈین لٹریچر"جاری کیا گیا۔ متعدد مقامات پر جلسے ہوئے۔کسان کانفرنسوں میں اس تحریک کے مقاصد کی نشرواشاعت کی گئی ۔۱۹۳۸۱ء میں کلکتہ میں ایک کُل ہند کانفرنس منعقد ہوئی جس کا افتتاحی خطبہ رابندرناتھ ٹیگور نے لکھا۔ٹیگور کے خطبے میں منشی پریم چند کے نقط نظر کی بازگشت سنائی دیتی تھی۔اس خطبے کی اہم بات یہ تھی کہ معاشرے کو جاننا،سمجھنا اور اسے ترقی کی راہ دکھانے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سماج کی نبض پر انگلی رکھیں اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو ٹٹولیں ۔یہ اس وقت ممکن ہے جب ہماری ہمدردیاں انسانیت کے ساتھ ہوں اور ہم ان کے درد وغم ہوں۔(۱۳)

ترقی پسند تحریک کے پہلے پانچ سال ادبی سے زیادہ تبلیغی اہمیت رکھتے ہیں۔اس عرصے میں ادب پر کم اور" ترقی پسندی"پرزیادہ زور دیا گیا۔(۱۴)

ادب،ادیب اور سماج کے باہمی تعلق کے بارے میں مختلف سوال اسی دور میں اُٹھائے گئے جس کی بازگشت بہت دیر تک ترقی پسندوں کی تحریروں میں سنائی دیتی رہی۔اس تحریک کے زیرِ اثر یہ بات پہلی بار کہی گئی کہ سماج میں تبدیلیاں محنت کش طبقے کی حرکت وعمل سے آتی ہیں ۔گوکہ اس طبقے کا اب تک استحصال ہوتارہا ہے ۔چنانچہ ادب کاکام سماج کی ایسی تبدیلی میں حصہ لینا ہے جو انسانوں کے استحصال کو ہمیشہ کے لیے ختم کردے،اور یہ بات بھی بالکل نئی تھی کہ ادب ان معنوں میں الہامی نہیں ہوسکتا کہ انسانی زندگی کے سیاق

Downloaded From Tajassus.com

وسباق سے مطلق آزاد ہوجائے۔ادب کی نشو ونما سماجی عوامل کے زیرِ اثر ہی ہوتی ہے ۔اس نظریے کی بدولت اردو والے ایک نئی فکری جہت سے آشنا ہوئے۔(۱۵)

ترقی پسند تحریک ادبی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی تحریک بھی تھی۔علی سردار جعفری نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ سیاست ہر جگہ ہے،ہر طرف ہے،فن اور ادب کی ہر تخلیق میں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کہیں سیاست ترقی پسند ہے اور کہیں رجعت پرست۔جب فن پارے میں ترقی پسند سیاست ہوتی ہے تو فوراً انگلیاں اُٹھتی ہیں کہ یہ فن نہیں سیاست ہے اور اگر سیاست رجعت پرست ہے تو وہ اعلیٰ درجے کا فن ہے ،تفریح (Entertainment)ہے۔(۱۶)

ادھر تحریک کے اہم ستون احمدعلی نے کسی ادبی تحریک میں سیاسی نظریات کے فروغ کو باعثِ انتشار قرار دیا تو وہ رانۂ درگاہ ہوگئے۔احمدعلی کے اختلاف نے ترقی پسند تحریک کو دودبستانوں میں تقسیم کردیا ،ان میں سے ایک دبستان نظریاتی اور سیاسی تھا جس کی نمائندگی سجادظہیر،علی سردار جعفری اور ڈاکٹر عبدالعلیم کرتے تھے دوسرا دبستان غیرنظریاتی اور ادبی تھا اور اس کی نمائندگی احمدعلی اور اختر حسین رائے پوری نے کی۔ تحریک کا سیاسی دبستان زیادہ منظم ،فعال،سرگرم اور مستعد تھا اور اس نے مستقبل پر اثرانداز ہونے کی سعی کی۔مؤخر الذکر دبستان غیر منظم اور منتشر تھا اور اس کے ادباءنے اپنی ادبی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے انفرادی سطح پر تخلیقی کام کیا ۔ان ادباءکے فن نے پریم چند کے خطبۂ صدارت سے روشنی حاصل کی اور خارجی حقیقت کو جمالِ فن سے پیش کرنے کی کوشش کی۔اوّل الذکر دبستان میں بالعموم وہ نوجوان شامل تھے جو ادب میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لیے مناسب موقع ومحل کی تلاش میں تھے ۔چنانچہ تحریک کے آغاز نئے ادبا کا جو گروہ سامنے آیا ان میں سبطِ حسن،کرشن چندر،حیات اللہ انصاری،خواجہ احمد عباس ،اوپندرناتھ اشک،سلام مچھلی شہری،مسعوداخترجمال،عصمت چغتائی،اختر انصاری دہلوی،فیض احمد فیض،مخدوم محی الدین،احتشام حسین،محسن عبداللہ،علی اطہر،شہاب ملیح آبادی،اسرارا لحق مجاز،معین احسن جذبی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔اس دبستان نے تحریک کے ابتدائی ایّام میں ملک کے بیش تر بڑے ادیبوں کو اپنے ساتھ شامل کرلیا لیکن جونہی اس تحریک کے نظریات کو فروغ حاصل ہوا اور اس کے قدم جم گئے تو پُرانے ادباءپسِ منظر میں چلے گئے اور ان کی جگہ نئے ادباءنے لے لی۔

ترقی پسند تحریک کے فروغ کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اسے نہ صرف آغاز میں نیا خون وافر مقدار میں مہیا ہو گیا بلکہ مرورِ ایّام کے ساتھ اس میں مزید تازہ خون بھی شامل ہوتا گیا ،چنانچہ ۱۹۴۷ء تک جو لوگ ادب کے مطلع پر نمودار ہوئے ان میں سے بیش تر کا تعلق ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی تھا۔چند اہم نام یہ ہیں:کیفی اعظمی،فکرتونسوی،ساحر

Downloaded From Tajassus.com

لدھیانوی،دیوندرستیارتھی،انور،ابن انشا،عارف عبدالمتین ،احمدندیم قاسمی،ممتازحسین،غلام ربانی تاباں،عبادت بریلوی،عبداللہ ملک،مسلم ضیائی،ابراہیم جلیس،نیاز حیدر،فارغ بخاری،شوکت صدیقی،انور عظیم،مطلبی فریدآبادی،سرلادیوی،منیب الرحمٰن،ظہیر بابر،عزیز حامد مدنی،حمیداختر،ظہیر کاشمیری،مجروح سلطان پوری،قدوس صہبائی،مہندرناتھ،سلامت اللہ،عادل رشید،اخترالایمان،بلونت سنگھ،وشوامترعادل،ہنس راج رہبر،مخمور جالندھری،حاجرہ مسرور،خدیجہ مستور،پرکاش پنڈت،اختر انصاری اورظ-انصاری وغیرہ-یہ لوگ ادب کی سب اصناف میں قلم آزمائی کرتے رہے تاہم ادباءکے اس انبوہ میں سب ادباءصفِ اوّل کے نہ تھے اور جب وقت کا تناطر بدل گیا تو ان میں بیش تر آسمانِ ادب کی پہنائیوں میں گم ہوکررہ گئے-(۱۷)

ترقی پسند تحریک کا دوسرا دوردوسری جنگِ عظیم سے آزادی حاصل کرنے تک پھیلا ہوا ہے - برّصغیر کی تاریخ کا یہ زمانہ شدید ترین سیاسی اور سماجی آویزش کا زمانہ تھا -جب جنگِ عظیم چھڑی تو تحریک کو کیمونسٹ پارٹی کا حصہ سمجھ کر سجاد ظہیر،علی سردار جعفری اور عبدالعلیم کو گرفتار کرلیا گیا چنانچہ تحریک تعطل کا شکارہوگئی -جب سجادظہیر کو رہا کیا گیا تو انہوں نے تحریک کو دوبارہ منظم کیا اور ۱۹۴۲ء کی دہلی کانفرنس میں غیرترقی پسند ادباءکو مدعو کرکے یہ باور کرانے میں کامیاب ہوگئے کہ تحریک میں ہرقسم کے نظریات کے لوگ شامل ہیں -اس کانفرنس کی خصوصیت ہی یہ تھی کہ اس میں ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ ساتھ غیرترقی پسند ادیب بھی فاشزم کے خلاف ہم آواز ہونے کے لیے مجتمع ہوئے تھے - خاص طور پر حلقۂ اربابِ ذوق کا گروپ جو ادب میں افادیت سے منکرتھا اور ترقی پسند ادب کی تحریروں کو پروپیگندہ کہتا تھا -اس گروپ کے اکثر ادیب انگلستان اور فرانس کے اشاریت پسندوں اور ہیئت پرستوں سے متاثر تھے-چنانچہ اس اجلاس میں جہاں ایک طرف سجاد ظہیر ،ڈاکٹر علیم،سبط حسن،کرشن چندر،مجاز،سردار جعفری اور رشید جہاں کا گروہ تھاتو دوسری طرف راشد،میراجی،مولانا صلاح الدین احمد ، قیوم نظر ،مولانا عبد المجیدسالک اورحفیظ جالندھری اس کا نفرنس میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے-(۱۸)

ترقی پسند تحریک نے وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کرنے کی جو طرح ڈالی تھی اس نے تحریک کے مقاصد کو نشر کرنے میں بڑی مدد دی-اس تحریک کی پروپیگنڈہ مشینری اتنی تیز تھی کہ نئے لکھنے والے اپنے آپ کو ترقی پسند تحریک سے وابستہ سمجھتے اور اس کا رکن بنے بغیر اسے اپنے حلقے میں فروغ دینے کی سعی کرتے-اس دور کے اہم ادبی رسائل مثلاً ادبی دنیا،ساقی،ہمایوں اور نیرنگِ خیال وغیرہ میں جو ادب شائع ہورہا تھا وہ مخزن،نگار،زمانہ اور معارف کے ادب سے یکسر مختلف تھا اور فرد کو بغاوت پر آمادہ کرنے

Downloaded From Tajassus.com

کے بجائے زندگی کے کھردرے عمل کو تہذیب آشنا کرتا تھا۔تاہم ترقی پسندی کا سکّہ اتنا مقبول ہوا کہ اس نئے ادب کو بھی ترقی پسند ادب کا حصّہ شمار کیا گیا ،چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ ترقی پسند تحریک کے فروغ میں ربع چہارم کے نئے ادب نے بھی بالواسطہ طور پر معاونت کی اور دہلی کانفرنس میں جب ملک بھر کے ادباءکی مشترکہ آواز اُبھری توترقی پسند اور غیرترقی پسند ادیب میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔دہلی کانفرنس نے ترقی پسند تحریک کو دوبارہ زندہ کردیا۔(۱۹)

برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ہی ترقی پسند مصنفین کی انجمن دوحصوں میں بٹ گئی ۔ترقی پسند تحریک کا تیسرا دور آزادی کے بعد شروع ہوا جو اس کے لیے داغ داغ اجالا ثابت ہوا۔ پاکستانی ترقی پسندوں کی پہلی کانفرنس منعقدہ ۶دسمبر ۱۹۴۷ءادبی سے زیادہ سیاسی مقاصد لیے ہوئے تھی ،چنانچہ ڈاکٹر تاثیر،مولانا صلاح الدین احمد،پطرس بخاری،میاں بشیر احمد،شیر محمد اختر ،یوسف ظفر،قیوم نظر اور شورش کاشمیری جو ترقی پسند نظریات سے متفق نہیں تھے ۶دسمبر کے اعلان نامے سے الگ ہوگئے۔حکومت نے سویرا،نقوش اور ادبِ لطیف وغیرہ جو تحریک کے ترجمان تھے،پر پابندی عائد کردی ۔ادبی رسائل کی متذکرہ بندش کو ترقی پسند ادباءنے تحریک پر براہِ راست حملہ قرار دیا اور اس کے خلاف شدید غم وغصے کا اظہار کیا ۔نومبر ۱۹۴۹ءکی پہلی کل پاکستان کانفرنس میں نیا منشور منظور ہوا جو اشتراکی نظام کی بازگشت تھا۔۱۹۵۲ء میں اس منشور پر نظرِ ثانی کی گئی ۔اس منشور میں سیاسی عمل اختیار کرنے کے بجائے ادب کو فوقیت دی گئی ۔نیا منشور منظور کرلینے کے بعد بھی حکومت نے تحریک کی سیاسی حیثیت کو برقرار رکھا چنانچہ جب ۱۹۵۳ء میں کیمونسٹ پارٹی پر پابندی لگائی گئی تو ترقی پسند تحریک بھی احتساب کی زد میں آگئی اور اسے بھی خلافِ قانون قرار دے دیا گیا ،نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسند تحریک کا شیرازہ منتشر ہونے لگا ۔جس طرح ہر عروج ایک زوال پہ منتج ہوتا ہے اسی طرح ترقی پسند تحریک کو بھی زوال آکے رہا۔ اردوادب کی اتنی اہم اور مقبول تحریک کے زوال اور مخالفت کی وجوہات کی سرحدیں بھی آپس میں ملتی ہیں جن کا خود ترقی پسند دانشوروں کو احساس تھا، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی رقمطراز ہیں:

”تحریک کی مقبولیت کے بعد کمتر صلاحیتوں کے لوگ بھی اسی دھارے میں بہنے لگتے ہیں ۔وہ اس قافلے سے الگ ہوتے ہوئے بھی اس میں شامل رہنے کو ترجیح دیتے ہیں ۔یہ منزل تحریک کے لیے اس لیے کٹھن ہوتی ہے کہ تحریک کے مقاصد جیسے جیسے حاصل ہونے لگتے ہیں اس کی چھتر چھایامیں بے سمت وجہت ادب وجود میں آنے لگتا ہے ۔ظاہر ہے اس کے خلاف احتجاج

Downloaded From Tajassus.com

ہوتا ہے اور یہ احتجاج تحریک کی مخالفت کی شکل اختیار کرلیتا ہے جو خود ادب میںایک تحریک یا رجحان بن جاتا ہے ۔ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی یہ سب کچھ ہونا تھا اور ہوا۔"

Downloaded From Tajassus.com